میڈیا روپ اور بہروپ

سہیل انجم

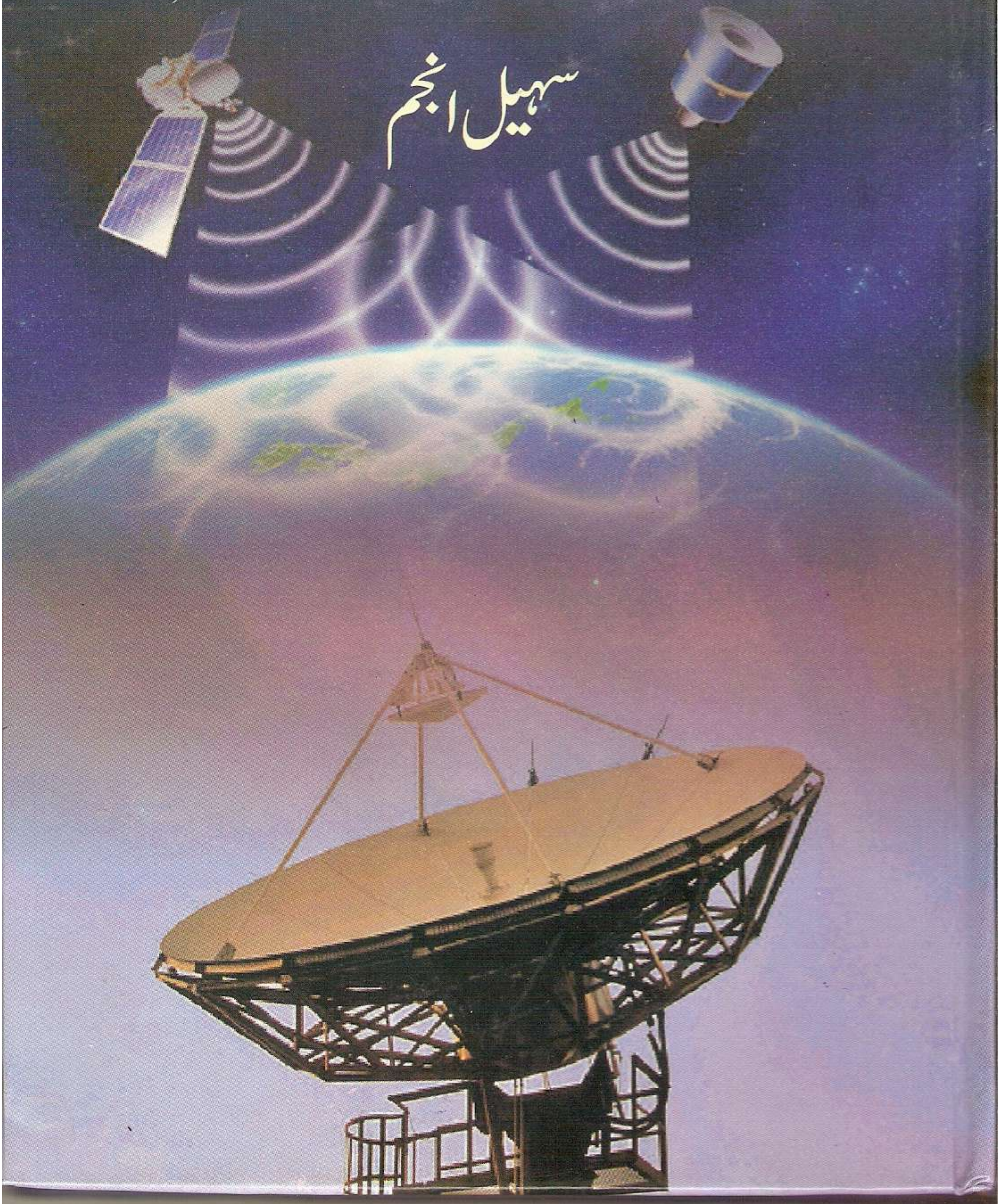

میڈیا روپ اور بہروپ

سہیل انجم

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

ISBN : 978-81-929097-5-2

نام کتاب	:	میڈیا روپ اور بہروپ (اپڈیٹ ایڈیشن)
مصنف	:	سہیل انجم
تعداد	:	500
قیمت	:	400
پہلا ایڈیشن	:	۲۰۰۷
دوسرا ایڈیشن	:	۲۰۰۸
تیسرا ایڈیشن	:	۲۰۱۴
چوتھا ایڈیشن	:	۲۰۱۵
پانچواں ایڈیشن	:	۲۰۲۲
ناشر	:	سہیل انجم

مصنف کا پتہ : 370/6A ذاکر نگر، نئی دہلی۔110025
M. 9818195929 - 9582078862

sanjumdelhi@gmail.com

فہرست

(۱)ابتدائیہ ۶

☆ پیش لفظ — سہیل انجم

☆ محاسبہ میڈیا کا — سعید سہروردی

☆ میڈیا کا پوسٹ مارٹم — محفوظ الرحمٰن

☆ اردو صحافت: کچھ تلخ تجربات — موہن چراغی

(۲)میڈیا اپنے آئینے میں ۲۵

☆ میڈیا اور ہمارا معاشرہ

☆ نیشنل میڈیا اور مسلم معاشرہ

☆ دہشت گردی، مدارس اور میڈیا

☆ میڈیا اور عالم اسلام

☆ میڈیا کا منفی رویہ

☆ میڈیا اور خوف کی نفسیات

☆ قومی پریس اور فرقہ واریت

☆ آج کے ٹی وی سیریل: موضوعاتی جائزہ

☆ گجرات فسادات میں میڈیا کا رول

(۳)میڈیا کی تکنیکی شناخت اور رسائی ۱۱۸

☆ الیکٹرانک میڈیا کی رسائی
☆ نیوز چینلوں کے اسٹنگ آپریشن
☆ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کا تقابلی جائزہ
☆ ایس ایم ایس: ایک انوکھا ذریعہ ترسیل
☆ ریڈیو اور ٹی وی نشریات: ابتداء اور ارتقاء
(۴) اردو منظر نامہ ۱۸۸
☆ الیکٹرانک میڈیا اور اردو
☆ اردو پریس اور جذباتیت
☆ اردو صحافت کے مسائل پر طائرانہ نظر
☆ قصۂ درد سناتے ہیں کہ......
☆ اردو کی اہم قابل ذکر ویب سائٹس
(۵) جدید گوشہ ۲۲۴
☆ میڈیا کا مثبت و منفی چہرہ: ایک تازہ تناظر
☆ میڈیا اور مسلمانوں کا رشتہ
☆ میڈیا اور طلبائے مدارس
☆ اسلاموفوبیا: مغربی میڈیا کا مرغوب موضوع
☆ ویبینار: عہد حاضر کا جدید پلیٹ فارم
پس نوشت ـ ـ ـ ـ ـ ۲۵۹

انتساب

میں اپنی یہ قلمی کاوش اپنے والدین کے نام معنون کرتا ہوں

کہ

جن کی محبت و تربیت آج بھی میرے لئے مشعل راہ

اور

جن کی دعائیں میرے لئے قیمتی اثاثہ ہیں۔

(سہیل انجم)

(۱)

ابتدائیہ

پیش لفظ

گزشتہ دو دہائیوں میں ہندوستان نے جن شعبوں میں سب سے زیادہ ترقی کی ہے ان میں میڈیا کا شعبہ بھی ہے۔ اس شعبے میں جو انقلاب آیا ہے وہ بہت خوش آئند ہے اور اس نے ہندوستان کو عالمی سطح پر ایک اہم مقام دلایا ہے۔ میڈیا جمہوریت کا چوتھا ستون ہے اور یہ چوتھا ستون آج انتہائی طاقتور ہو گیا ہے۔ اتنا طاقتور کہ اگر باقی تین ستونوں میں سے کسی ایک میں ذرا بھی لرزش پیدا ہوتی ہے تو یہ چوتھا ستون اس کو تھام لیتا ہے اور اس طرح ہندوستانی جمہوریت کی عمارت پھر پہلے کی مانند محفوظ و مامون ہو جاتی ہے۔ یہاں میڈیا کو پوری آزادی حاصل ہے۔ وہ جو چاہے کرے اور جس سیاستداں یا جس شخصیت سے جو سوال چاہے پوچھے۔ کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ ہندوستانی آئین نے میڈیا کو جو آزادی دی ہے وہ بھی اس کی انقلاب آفریں ترقی میں معاون بنی ہوئی ہے۔ یہ بات بہت ہی حوصلہ بخش ہے اور اس سے حوصلہ پا کر ہی تعلیم یافتہ نوجوان گروہ در گروہ میڈیا میں داخل ہو رہے ہیں۔ میڈیا میں بہت ساری برائیوں کے باوجود اس پر لوگوں کا اعتبار قائم ہے اور بہت سے ایسے لوگ جو کسی معاملے میں ان کے خیال میں پھنسا دیئے جاتے ہیں وہ خود کو پولیس کے حوالے کرنے سے قبل میڈیا کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ پولیس میں جانے کے بعد وہ آزادی سے کچھ نہیں کہہ سکیں گے اس لئے اس سے پہلے میڈیا میں آ کر وہ اپنی بات رکھتے ہیں اور میڈیا سے انصاف کا مطالبہ کرتے ہیں۔ حالیہ دنوں میں ایسے متعدد واقعات ہوئے ہیں کہ پولیس نے ملزموں کو میڈیا کے نیوز روم سے گرفتار کیا ہے۔

یہ صورت حال میڈیا کے مزید فروغ کی جانب واضح اشارہ کرتی ہے اور اگر اپنی تمام تر خرابیوں کے باوجود میڈیا نے اپنا اعتبار اور وقار برقرار رکھا تو اس کو مزید آگے بڑھنے سے

کوئی نہیں روک سکے گا۔ آج ہندوستان میں ۳۵۰ سے زائد ٹی وی چینل ہیں جن میں ۳۶ نیوز چینل ہیں۔ جبکہ بیس سال قبل ہندوستان میں صرف ایک چینل ہوا کرتا تھا۔ یہ میڈیا کا فروغ ہی ہے کہ آج ہندوستان دنیا کا تیسرا بڑا ٹیلی ویژن مارکیٹ بن گیا ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ہندوستان نیوز چینل، انٹرٹینمنٹ چینل، بالیووڈ، ریڈیو، اخبارات ورسائل اور جرائد میں فروغ کے سبب دنیا کا سب سے بڑا انٹرٹینمنٹ مارکیٹ بن جائے گا۔ ایک رپورٹ کے مطابق دنیا کی انٹرٹینمنٹ انڈسٹری ۲۰۱۵ء تک ۱۰۸ کھرب ڈالر سے بھی تجاوز کر جائے گی اور اس میں ہندوستان کا حصہ ۲۰۰ ارب ڈالر کا ہوگا۔

میڈیا کے فروغ اور ٹی وی چینلوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ کے سبب چینلوں میں زبردست مقابلہ بھی چل رہا ہے اور بریکنگ نیوز کے لیے جانے کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑ رہے ہیں۔ اب تو یہ بریکنگ نیوز بریکنگ نیوز نہ رہ کر ٹوٹتی ہوئی خبریں ہو گئی ہیں۔ اب تو شاہد کپور اور قرینہ کپور کی بوسہ بازی کا منظر بھی بریکنگ نیوز بن جاتا ہے۔ عدالت سلمان خان کے خلاف سماعت کرتی ہے تو وہ بھی بریکنگ نیوز بن جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایشوریہ رائے کے انٹرویو کو بھی بریکنگ نیوز کے طور پر دکھایا جاتا ہے۔ بریکنگ نیوز کے اس رجحان نے حقیقی بریکنگ نیوز کے تصور کو ہی پاش پاش کر دیا ہے۔ یہ رجحان میڈیا کے وقار اور اعتبار میں گراوٹ کا سبب بن سکتا ہے۔ اس پر نیوز چینلوں کے ذمہ داروں کو غور کرنا چاہئے۔ اس صورت حال نے سنجیدہ صحافت کو بھی نقصان پہنچایا ہے تاہم ابھی اتنا نقصان نہیں پہنچا ہے کہ اس پر سے اعتبار ہی اٹھ جائے۔

آج جو نوجوان میڈیا میں آرہے ہیں ان میں بعض ایسے ہوتے ہیں جن کو کچھ زیادہ معلومات نہیں ہوتی۔ بی بی سی کے پال ڈونہر (Paul Donahar) نے کئی سال قبل کے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ بقول ان کے ایک نوجوان جرنلسٹ اس وقت کے وزیر داخلہ اندر جیت گپتا کا پیچھا کر رہا تھا، اور جب وہ ان کے قریب پہنچا تو اس نے پہلا سوال یہ کیا کہ ''سر! آپ کچھ کہیں گے؟'' اور اس کا دوسرا سوال تھا ''سر! آپ کون ہیں؟'' اس قبیل کے نوجوان جرنلسٹ آج بھی مل جائیں گے۔

آج نیوز چینلوں کی ایک خرابی یہ ہے کہ اگر کوئی بڑا واقعہ ہوا تو وہ پورے دن بلکہ کئی کئی دنوں تک اس کو دکھاتے رہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اور کوئی دوسری خبر ہی نہیں ہے۔ میڈیا والے ایسے واقعات کو تلاش بھی کرتے ہیں جن سے وہ فائدہ اٹھا سکیں اور اپنا ٹی آر پی بڑھا سکیں۔ حالیہ واقعہ ہریانہ کے بچے پرنس کا ہے جو ۶۰ فٹ گہرے گڈھے میں گر گیا تھا اور جس کو نکالنے میں ساٹھ گھنٹے لگے تھے۔ اس واقعہ کو ایک تفریحی واقعہ کے طور پر دکھایا جاتا رہا اور بچے پر اس کے والدین پر کیا گزر رہی ہے اس پر کم توجہ تھی۔ جب فوجی جوانوں نے بچے کو نکالا تو کیمرے کا فوکس فوجی جوانوں کے بجائے اس پر تھا کہ بچہ کہاں ہے اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے اب کیا ہو رہا ہے اور آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ بچے کو بچانے کا آپریشن ختم ہونے کے بعد کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ ٹیوب ویل کا گڈھا کھلا کیوں چھوڑ دیا گیا تھا اور جنھوں نے ایسا کیا تھا ان کے خلاف کوئی کارروائی ہونی چاہئے یا نہیں۔ چند روز بعد ایک نجی ٹی وی چینل اسے اس انداز میں ادھر ادھر لے جا رہا تھا جیسے کہ اسے اس نے گود لے لیا ہو۔ پرنس کو بمبئی لے جایا گیا فلمی اداکاروں اور اداکاراؤں سے ملوایا گیا۔ ایک چینل پر گانوں کے مقابلے میں شریک ہونے والے بچوں کے ساتھ اس کو پورا دن رکھا گیا۔ دراصل ٹی وی چینلوں نے پرنس کو بزنس کرنے کا ایک ہتھیار بنا لیا۔ اس سے اپنا ٹی آر پی بڑھایا۔ لیکن کسی نے بچے کی تجسس آمیز آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی، کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ کہیں اس سے اس کا بچپن تو متاثر نہیں ہو رہا ہے۔ حالانکہ ایسے واقعات ہندوستان میں عموماً ہوتے رہتے ہیں۔ مگر ہر واقعہ پر میڈیا مہربان نہیں ہوتا۔ ''را'' کے سابق سکریٹری وکرم سود سوال کرتے ہیں کہ ہمارا میڈیا ان چیزوں کو دکھانے اور شاہد قرینہ کی بوسہ بازی کو سنسنی خیز بنا کر پیش کرنے کے بجائے نیشنل جیوگرافک چینل، اینیمل پلانٹ اور ڈسکوری چینل کی مانند دستاویزی فلمیں کیوں نہیں بناتا۔ نکسل مسئلے پر کوئی دستاویزی فلم کیوں نہیں بنائی جاتی۔ حکومتوں کی ناقص کارکردگیوں پر فلم کیوں نہیں بنائی جاتی۔ خودکشی کرنے والے کسانوں پر فلم کیوں نہیں بنتی۔ ملک میں پانی اور گیہوں کی قلت پر فلم کیوں نہیں بنائی جاتی۔ سماج کو بہتر بنانے اور فرقہ وارانہ یگانگت پیدا کرنے والے پروگرام کیوں نہیں دکھائے جاتے۔ کیوں صرف سنسنی خیزی

ہی کو پروان چڑھایا جاتا ہے۔ میڈیا کا کام صرف بزنس کرنا ہی نہیں بلکہ سماج کو اطلاعات فراہم کرنا بھی ہے۔ مگر آج جس انداز میں اطلاعات فراہم کی جا رہی ہیں ان میں تجارتی پہلو کو اولیت حاصل رہتی ہے۔ اسی طرح آج نیوز چینل جس قسم کا اسٹنگ آپریشن کر رہے ہیں اس کو سنجیدہ طبقے کی تائید حاصل نہیں ہے۔ آج کا اسٹنگ آپریشن اسکینڈل کو بے نقاب کرنے والا کم، لوگوں کو پھنسانے والا زیادہ بن گیا ہے۔

آج میڈیا کی سوچ میں بہت تبدیلی آ گئی ہے۔ خاص طور پر ۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء اور ۱۱؍ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات کے بعد اس کا زاویہ نظر تبدیل ہو گیا ہے۔ ۶؍دسمبر کے واقعہ نے ہندوستانی میڈیا کو اتنا متاثر نہیں کیا جتنا کہ نائن الیون نے کیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ نائن الیون مغربی میڈیا کے حواس پر چھایا ہوا ہے اور ہندوستانی میڈیا مغربی میڈیا کی نقالی میں اس سے بھی دو قدم آگے نکل گیا ہے۔ آج میڈیا کے پاس دو دماغ ہیں اور دو زبانیں ہیں، دو نقطہ نظر ہے، دو زاویہ نگاہ ہے اور دو عینکیں ہیں۔ ایک عینک سے وہ مسلمانوں کو دیکھتا ہے اور دوسرے سے باقی دنیا کو۔ پہلی عینک سے پوری دنیا کا مسلمان دہشت گرد اور تخریب پسند نظر آتا ہے اور وہ اسی عینک سے مسلمانوں کو دیکھنا پسند بھی کرتا ہے۔ ٹی وی چینلوں کے بیشتر اینکر اسی چشمے کو پہنے ہوئے ہیں اور اسی سے وہ مسلمانوں کو دیکھتے ہیں۔

مالیگاؤں بم دھماکوں کے بعد ایک نیوز چینل پر ڈسکشن چل رہا تھا، اینکر بار بار یہ کہہ رہا تھا کہ وہ جو سوال پوچھ رہا ہے وہ کسی نظریے کا چشمہ لگائے بغیر پوچھ رہا ہے مگر اس کا ہر سوال مسلم مخالف تھا۔ بالآخر مباحثے میں شریک جاوید اختر اور تیستا سیتلواڑ کو اسے ڈانٹنا پڑا۔ یہ کہنا پڑا کہ تم اپنے سوالات کا زاویہ ٹھیک کرو، تمہارا ہر سوال فرقہ پرست ہے۔ یہ کسی ایک چینل کی کہانی نہیں ہے بلکہ بیشتر چینلوں پر ایسا ہی ہو رہا ہے۔ تیستا نے مالیگاؤں دھماکوں کی رپورٹنگ کے سلسلے میں ان ا خبارات اور نیوز چینلوں کی اچھی خبر لی جو ان دھماکوں کے ساتھ ساتھ مالیگاؤں کی فرقہ وارانہ منافرت کی تاریخ بیان کرنے پر زیادہ زور دے رہے تھے۔

میڈیا کی بدلی ذہنیت کا اندازہ ایک اور واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ اسی سال اپریل میں

بجرنگ دل اور وشو ہندو پریشد کے ایک معروف کارکن کے گھر میں بم بناتے ہوئے دو لوگوں کی موت ہوگئی۔ پولیس نے اس واقعہ میں بچ جانے والے ایک شخص اور ایک عینی شاہد سے پوچھ تاچھ کی۔ انھوں نے برین میپنگ اور نارکو انالیسس ٹیسٹ میں یہ اعتراف کیا کہ انھوں نے ہی ۲۰۰۳ء میں پربھنی میں مسجد کے باہر دھماکہ کیا تھا اور ۲۰۰۴ء میں جالنا اور پورنا میں مسجدوں کو نشانہ بنا کر دھماکے کئے تھے۔ مگر یہ خبر کہیں نظر نہیں آئی۔ اخبارات نے ممکن ہے کہ ایک کالمی خبر بنا کر کہیں چھاپ دی ہو مگر الیکٹرانک میڈیا نے اس پر مباحثہ نہیں کیا اور اس کو نمایاں کر کے پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ اخبار ہندوستان ٹائمز نے ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۶ء کے اداریے میں اس واقعہ کو ضرور شامل کیا۔

تاہم میڈیا بعض اوقات ایسے کام بھی کرتا ہے جو فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے نقطہ نظر سے قابل ستائش ہوتے ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ ہاں گجرات فسادات کے دوران میڈیا کی غیر جانبدارانہ کوریج کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جس نے مودی اینڈ کمپنی کو پوری طرح بے نقاب کر دیا تھا۔

میں نے اس کتاب میں الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا اور بالخصوص الیکٹرانک میڈیا کے مختلف پہلوؤں کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے اور انتہائی غیر جانبدارانہ انداز میں میڈیا کے کردار کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض گوشے تشنہ رہ گئے ہوں یا میرے قلم کی گرفت سے بچ گئے ہوں۔ تاہم میں نے ایک عمومی نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے چند مضامین بعض سیمناروں میں پڑھے گئے ہیں لیکن ۹۰ فیصد مضامین غیر مطبوعہ ہیں اور جن کو کہیں پڑھا نہیں گیا ہے۔

میں ان مضامین کی تیاری اور ان کو کتابی شکل میں پیش کرنے کے لئے بزرگ صحافی اور مشفق و محترم جناب محفوظ الرحمٰن صاحب کا انتہائی شکر گزار ہوں کہ انہی کی تحریک اور حوصلہ افزائی سے یہ مضامین تحریر کیے گئے اور اب کتابی شکل اختیار کر رہے ہیں۔ میں روزنامہ قومی آواز دہلی کے ایڈیٹر جناب موہن چراغی صاحب اور سرکردہ صحافی اور ملک کے چند ممتاز کالم نگاروں میں سے ایک جناب سعید سہروردی صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اس کتاب پر اپنی آراء تحریر کرنے کی

زحمت گوارا فرمائی۔ انتہائی ناسپاسی ہوگی اگر میں مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب اور ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کا شکریہ ادانہ کروں، کیونکہ ان کی کوششوں اور تعاون سے یہ کتاب منظر عام پر آ گئی ہے۔ میں اپنی شریک حیات انیسہ انجم، بیٹے سلمان فیصل اور بیٹیوں نسیم صبا، ناہید درخشاں اور شمع فروزاں کا بھی شکرگزار ہوں کہ انھوں نے مجھ کو گھریلو کاموں کی ذمہ داریوں سے فارغ کر کے ایک ایسا علمی اور پُرسکون ماحول فراہم کیا جس میں میں ان مضامین کو تحریر کر سکا اور اس موضوع کا گہرائی سے جائزہ لے سکا۔ میں بیٹے سلمان فیصل کا اس لئے بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی تعلیمی مصروفیات میں سے وقت نکال کر بیشتر مضامین کی کمپوزنگ کی اور مواد کی تیاری میں میرا ساتھ دیا۔ میرے اہل خانہ کا یہ تعاون مجھے حاصل نہ ہوتا تو شاید میں یہ کتاب آپ کے سامنے پیش نہیں کر پاتا۔ مضامین کیسے ہیں اور میں نے اس موضوع کا کتنا حق ادا کیا ہے اس کا فیصلہ آپ قارئین کریں گے اور مجھے آپ کی آراء کا شدت سے انتظار رہے گا۔

والسلام

سہیل انجم

محاسبہ میڈیا کا

سعید سہروردی

سہیل انجم نے ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے، جو ہمارے دور میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔اس وقت پورے ماحول پر میڈیا کے اثر کو''غلبہ'' کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ہم اس کے مقابلے میں خود کو بے بس پاتے ہیں۔اگر دنیا کے مسلمانوں کی نظر سے دیکھیں تو میڈیا ان کے خلاف ایک زبردست ہتھیار کے طور پر استعمال ہورہا ہے۔عالمی سطح پر یہ احساس پیدا ہورہا ہے کہ ہم کو جوابی حملے کی تیاری کرنی چاہیئے۔کوئی حملہ دشمن کو سمجھے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتا۔سہیل انجم نے ''میڈیا۔روپ بہروپ'' کے ذریعہ اس تیاری کو علمی اور عملی شکل دی ہے۔اپنے موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے''چھوٹا سا لفظ 'میڈیا' اپنے دامن میں اطلاعات، نشریات اور ترسیل و ابلاغ کی اتنی وسعت رکھتا ہے کہ دنیا اس کے اردگرد سمٹ کر رہ گئی ہے۔ جب سے نیوز چینلوں کا زمانہ آیا ہے، یہ لفظ کثیر جہت بن گیا ہے''۔

میڈیا کا اردو متبادل تلاش کرنے میں دشواری ہوگی۔اپنی روایت اور کردار کے مطابق اردو نے اس لفظ کو اصطلاح کے طور پر قبول کرلیا ہے۔ان کی اس رائے سے اختلاف کی گنجائش نہیں۔''صحافت پہلے صرف اخبارات اور رسائل تک محدود تھی۔اس میدان میں ان کی بلا شرکت غیرے اجارہ داری تھی۔آج ایک اور شہسوار بھی اس میدان میں کود پڑا ہے، جو پہلے شہسوار کے مقابلے میں زیادہ تیز، زیادہ ذہین، زیادہ چمک دمک رکھنے والا، زیادہ دوررس، زیادہ زود اثر، زیادہ چالاک اور مطلوبہ مقام پر بہت جلد رسائی کرلینے کی قدرت رکھنے والا مرد میدان ہے''۔ الیکٹرانک میڈیا کی طاقت اور پرواز کا اعتراف کرنے کے بعد وہ یہ مانتے ہیں 'حالانکہ آج

الیکٹرانک میڈیا کا دور ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پرنٹ میڈیا غیر اہم ہو گیا ہے۔ اس کی آج بھی اپنی اتنی ہی اہمیت اور معنویت ہے جتنی کہ پہلے تھی اور باخبر حلقہ کا خیال ہے کہ اس کی اہمیت آئندہ بھی کم نہیں ہوگی۔'

الیکٹرانک میڈیا کو یہ فضیلت ہمیشہ حاصل رہے گی۔ وہ واقعات اور وارداتوں کو اخبارات اور رسائل سے پہلے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پرنٹ میڈیا واقعہ یا واردات پر تبصرہ کے لیے ہر ممکن ذریعہ کو استعمال کر سکتا ہے۔ اگر اس نظر سے دیکھیں تو دونوں ایک دوسرے کے رقیب اور حریف نہیں بلکہ معاون اور حبیب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کی حدود متعین کرنے سے پہلے وہ اس موضوع پر اپنے کام کی تحریک اور ترغیب کو واضح کرتے ہیں۔ یہ بات اس باب کے عنوان ''نیشنل میڈیا اور مسلم مسائل'' سے صاف ظاہر ہے۔ اخبار نویس کی حیثیت سے سہیل انجم نے اس کرب کو شدت سے محسوس کیا، جو ہر اس فرد کا مقدر ہے، جس کا واسطہ کسی نہ کسی شکل میں خبروں اور اخباروں سے پڑتا ہے۔ ان کے مطالعہ کا موضوع بنیادی طور پر ہندوستانی میڈیا ہے۔ اس جائزے میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا دونوں شامل ہیں۔ دونوں کے میدان جداگانہ ہیں، لیکن ان کے تعصّبات مشترک ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کی ملکیت کم و بیش مشترک ہے۔ اگر ''انڈیا ٹوڈے'' پر سنگھ پریوار کا اثر ہے تو ''آج تک'' اس دباؤ سے کیسے بچ سکتا ہے؟ ہر چینل کا تعلق کسی ملکی یا غیر ملکی میڈیا تنظیم سے ہے۔ جو اس کے اخبار کی پالیسی ہوگی، اس سے وابستہ چینل کی بھی وہی ہوگی۔

انھوں نے دو اہم تاریخوں کے سلسلے میں میڈیا کے رول پر روشنی ڈالی ہے۔ ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کی شہادت ہوئی۔ اس وقت ہندوستانی الیکٹرانک میڈیا ترقی یافتہ نہیں تھا۔ غیر ملکی چینل سی۔ این۔ این کی ویڈیو ریکارڈنگ ساری دنیا میں دیکھی گئی۔ ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ کے ورلڈ ٹریڈ ٹاور پر حملہ ہوا۔ دونوں وارداتوں کے درمیان دس برسوں سے کم کا عرصہ ہے۔ یہ عرصہ میڈیا کے عروج کا ہے۔ یہی وقت یک قطبی سپر پاور امریکہ کے غلبہ کا بھی ہے۔ ان دونوں وارداتوں کو الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ ساری دنیا میں دیکھا گیا۔ ۱۱ر ستمبر کو زیادہ بڑے پیمانے پر۔

میڈیا کے کردار پر تبصرہ کرتے وقت یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ الیکٹرانک میڈیا نے ان وارداتوں کو اسی طرح دکھایا جیسے کرکٹ، ہاکی یا فٹ بال میچ دکھائے جاتے ہیں۔ان کا ویڈیو ریکارڈ بھی بن جاتا ہے، جو آئندہ صحیح یا غلط کا فیصلہ کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا واقعات اور وارداتوں کا ویڈیو ریکارڈ بنانے کے ساتھ ان کے لاکھوں اور کروڑوں چشم دید گواہ بھی تیار کر دیتا ہے۔ان وارداتوں کے ویڈیو ریکارڈ کی موجودگی میں ان کے بارے میں گمراہ کرنا ممکن نہیں۔اگر بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈر بابری مسجد کی شہادت کے الزام سے بچ نہیں پاتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لاکھوں افراد نے موقعۂ واردات پر ان کو موجود دیکھا ہے، ان کی آواز سنی ہے۔ یہ ویڈیو ریکارڈ گجرات کے وزیراعلیٰ نریندر مودی کو مسلمانوں کی نسل کشی کا ملزم دکھاتا ہے۔ اسی ریکارڈ کی بنیاد پر سیکولر ذہن رکھنے والوں نے بابری مسجد کی شہادت کے بارے میں دستاویزی فلمیں بنائی ہیں۔

میڈیا کے رول اور اس کے اثر کو سمجھنے کے لیے ہمیں کچھ اور کرنا ہوگا۔ اردو نے میڈیا اور الیکٹرانک جیسے الفاظ کو قبول اور جذب کیا ہے۔اسی طرح دو مترادف انگریزی الفاظ میں سے کسی ایک کے اردو متبادل کو اصطلاح کی شکل میں قبول کرنا ہوگا۔ ایک لفظ ہے ''سسٹم'' (S y s t e m) جس کا اردو متبادل ''نظام'' ہوسکتا ہے ۔ دوسرا لفظ ہے ''اسٹیبلشمنٹ'' (Establishment) جس کا متبال ''بندوبست'' ہوسکتا ہے۔ دونوں کے مفہوم میں زیادہ فرق نہیں۔زیادہ غور کرنے کے بعد ''اقتدار'' کو ترجیح دوں گا۔ دونوں سے مراد قانون بنانے اور قانون نافذ کرنے والے ادارے اور ان کا غیر سرکاری ماحول ہے۔ہم ان میں سے کسی ایک کو اصطلاح کی شکل میں اختیار کر سکتے ہیں۔

قومی یا عالمی تناظر سے الگ کر کے میڈیا کے بارے میں آزادانہ اور منصفانہ رائے قائم کرنا ممکن نہیں۔ ہزار دعوے کیے جائیں، میڈیا دنیا کے کسی ملک میں پوری طرح آزاد نہیں۔ جمہوریت اور شخصی آزادی کا ڈھول پیٹنے والے امریکہ میں بھی نہیں۔

اقتدار سے الگ کر کے میڈیا کے رول کا جائزہ نہیں لیا جاسکتا۔اگر یہ احتیاط نہ برتی گئی تو ہم

ارباب اقتدار کے گناہ میڈیا کے کندھوں پر لاد دیں گے۔ بابری مسجد ہو یا ورلڈ ٹریڈ ٹاور پر فضائی حملہ، ان میں کہیں نہ کہیں حکومت یا 'اقتدار' کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بابری مسجد میں مورتیاں اس وقت رکھی گئیں، جب ملک کو آزاد ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ یہ کام ریاستی حکومت کے علم میں کیا گیا۔ ریاست کے کانگریسی وزیر اعلیٰ پنڈت گووند ولبھ پنت تھے، جن کا مجسمہ پارلیمنٹ کے قریب نصب ہے۔ ایک شاہراہ ان کے نام سے منسوب ہے۔ سیکولر جمہوری مزاج رکھنے والے پنڈت جواہر لال نہرو ملک کے وزیر اعظم تھے۔ اس وقت نہ دوردرشن تھا، نہ ٹی وی، نہ نیوز چینل۔ سنگھ پریوار کی روح رواں آر۔ ایس۔ ایس چوری چھپے اپنی شاکھائیں لگاتی تھی۔ بابری مسجد کی شہادت کا ذکر کرتے وقت میڈیا سے زیادہ حکومت کے کردار پر حرف آتا ہے۔ گاندھی جی کو جب گولی لگی تھی تو آر۔ ایس۔ ایس کی جو شاکھائیں عوام کے علم میں تھیں، ان پر حملے ہوئے تھے۔ عوام کی ناراضگی کے ڈر سے پنڈت نہرو کی حیات تک آر۔ ایس۔ ایس ایک خفیہ تنظیم رہی۔ اس نے سینہ بہ سینہ، گوش بہ گوش اپنا حلقۂ اثر بڑھایا۔ اس عرصہ میں نہ میڈیا نے اس کی طرف توجہ کی، نہ اس نے میڈیا کا سہارا لیا۔ پہلے انھوں نے لال بہادر شاستری کے دورِ حکومت میں اقتدار سے رشتے قائم کیے۔ ۱۹۶۵ء کی ہند۔ پاک جنگ نے ان کو کھل کر سامنے آنے کا موقع دیا۔ جے پرکاش نرائن کے سمپورن کرانتی آندولن میں شامل ہو کر قومی سیاست میں انھوں نے اپنی جگہ بنائی۔ پہلے جنتا پارٹی میں شامل ہوئے، پھر بھارتیہ جنتا پارٹی بنا کر الگ ہوئے۔ اب جے پرکاش نرائن کی بنائی ہوئی جنتا پارٹی کو ملک کی سیاست میں خوردبین سے تلاش کرنا پڑے گا۔ لیکن کانگریس کی سب سے بڑی سیاسی حریف بھارتیہ جنتا پارٹی ہے۔

جو تنظیمیں اپنی خفیہ سرگرمیوں کی وجہ سے اقتدار کی نظروں میں معتوب ہوتی ہیں، وہ میڈیا کے بجائے عوام پر اپنے اثر پر بھروسہ کرتی ہیں۔ ہندوستان کے بڑے سرمایہ داروں کے نقیب انگریزی اخباروں نے بائیں بازو کو نظر انداز کیا ہے یا ان پر ناقدانہ نظر رکھی ہے۔ اس چوکیداری کے باوجود مغربی بنگال، تری پورہ اور کیرالا میں ان کو اقتدار حاصل کرنے سے نہ روک سکے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ میڈیا کی عملداری کی اپنی حدود ہیں۔ وہ جو چاہے نہیں منوا سکتا۔ ہندوستانی میڈیا

کا ذکر کرتے وقت ایمرجنسی کے دور کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس زمانے میں اقتدار نے میڈیا پر پوری طرح غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ ایک صحافی نے اس دور پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا، ''ان سے جھکنے کو کہا گیا تو وہ سجدے میں چلے گئے''۔ اب ایمرجنسی نہیں ہے لیکن حاکم یہ بات خوب جانتے ہیں کہ کس کو کب کیسے جھکایا اور مغلوب کیا جا سکتا ہے؟ بڑے سرمایہ دار اشتہارات کو حربہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ حکومت کے پاس اشتہار کے علاوہ دوسرے حربے بھی ہیں، جن سے بوقت ضرورت کام لیا جاتا ہے۔

ونود مہتہ، اس وقت ''آؤٹ لک'' کے ایڈیٹر ہیں۔ انھوں نے اپنی خودنوشت کا عنوان رکھا ہے ''مسٹر ایڈیٹر! آپ وزیر اعظم کے کتنے قریب ہیں''۔ یہ سوال ان سے اخبار کے مالک سنگھانیہ نے کیا تھا۔ ونود مہتہ نے سنگھانیہ کے لیے انگریزی روزنامہ ''انڈین پوسٹ'' جاری کیا تھا۔ اخبار کی آزاد روش اور اس کی تنقید سے وزیر اعظم راجیو گاندھی ناخوش تھے۔ انھوں نے سنگھانیہ کو بلا کر شکایت کر دی۔ سنگھانیہ نے ونود مہتہ سے جو سوال پوچھا اس کی تہہ میں یہی بات تھی۔ کچھ عرصہ بعد سنگھانیہ کو اندازہ ہوا کہ اخبار نکالنے سے ان کو فائدہ کے بجائے نقصان ہو سکتا ہے۔ اخبار بند ہو گیا۔ اس سلسلے میں ترن تیج پال اور ان کے اخبار ''تہلکہ'' کا ذکر کرنا مناسب ہے۔ انھوں نے سہیل انجم کے الفاظ میں ''اسٹنگ آپریشن'' کر کے ایک بڑا قدم اٹھایا تھا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر بنگارو لکشمن کو روپیہ لیتے ہوئے کیمرے سے گرفت میں لیا تھا۔ اس کے علاوہ جارج فرنانڈیز کے گھر پر اور فوجی افسروں کی سودے بازی کی تصویریں بھی سامنے آئیں۔ بدعنوانیوں کے خلاف یہ شہادت پیش کرنے کا انعام کیا ملا؟ ''تہلکہ'' پر ہر طرف سے یلغار ہوئی۔ اس میں سرمایہ لگانے والوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ ان کے کاروبار کو متواتر چھاپوں سے تباہ کر دیا گیا۔ اس وقت قومی جمہوری اتحاد کی حکومت تھی۔ جب تک واجپئی اور اڈوانی کا اقتدار رہا، 'تہلکہ' کو سانس لینے کا موقع نہیں ملا۔

جہاں تک گیارہ ستمبر کا تعلق ہے۔ اگر امریکہ سپر پاور نہ ہوتا تو ایسا کچھ بھی نہ ہوتا جو ہوا۔ اگر کوئی اور ملک ہوتا تو سلامتی کے اس معاملے میں صدر یا وزیر اعظم کا استعفیٰ لازمی ہوتا۔ اندر کی

بات تھی، خفیہ ایجنسی کے سربراہ کی برطرفی ضرور ہوتی۔ اس نے حکومت کو بروقت اطلاع نہیں دی۔ سفارتی ذرائع سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی کہ امریکہ کے خلاف اتنی شدید نفرت کیوں ہے، جو چند نوجوانوں کو اپنی جان پر کھیلنے پر آمادہ کرسکتی ہے؟ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ایسا نہ ہونے سے ایک بات ظاہر ہوگئی کہ امریکی جمہوریت محض ڈھکوسلہ ہے۔ جمہوری عمل سے ایک ڈکٹیٹر اقتدار حاصل کرتا ہے، جسے قابو میں رکھنا آسان نہیں۔ امریکی صدر نے سارے الزامات سے بچنے کے لیے ایک مفروضہ ''دہشت گردی'' کا اختراع کرلیا۔ اس ''آسیب'' کا پیچھا کرتے ہوئے وہ افغانستان اور عراق کو برباد کرچکے ہیں لیکن اب تک یہ ثابت نہ ہوسکا کہ ان ملکوں کا گیارہ ستمبر کی واردات سے کوئی تعلق تھا بھی یا نہیں۔ اگر اس معیار سے دیکھیں تو ہندوستانی میڈیا اور ہندوستانی جمہوریت ہزار درجہ بہتر ہیں۔ یہاں حکومت کے خلاف آواز دبانے کی کوشش تو ہوسکتی ہے، لیکن اس کو پوری طرح دبانا اور کچلنا ممکن نہیں۔ اندرا گاندھی کو ۱۹۷۷ء میں یہ سبق مل گیا۔ بابری مسجد کی شہادت اور گیارہ ستمبر کی واردات دونوں قومی اور عالمی بندوبست کی بڑی کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بابری مسجد کی شہادت نے واضح کردیا کہ ملک میں ایسے عناصر موجود ہیں جو آئین کے پابند اور وفادار نہیں، ان کو ضرورت سے زیادہ چھوٹ دی گئی ہے۔ گیارہ ستمبر کے بعد کے واقعات نے دکھادیا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد امن کے قیام کے لیے جو انتظام ہوا تھا وہ مفلوج اور معطل ہوچکا ہے۔

یہ وہ باتیں ہیں جو سہیل انجم کی کتاب پڑھنے کے بعد ذہن میں آئیں ورنہ انھوں نے اپنے موضوع کا کوئی پہلو اور گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ صحافیوں کے علاوہ عام قاری کے لیے بھی اس کا مطالعہ منفعت کا ذریعہ ہوگا۔

میڈیا کا پوسٹ مارٹم

محفوظ الرحمٰن
سابق چیف ایڈیٹر روز نامہ ''قائد''، لکھنو و سہ روزہ ''دعوت''، دہلی

جواں سال صحافی سہیل انجم کی تصنیف میڈیا روپ اور بہروپ کے مسودے کے بیشتر حصے کو میں نے پڑھا ہے اور میں یہ بات پورے وثوق اور پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ فاضل مصنف نے حقائق کی تہہ تک اتر جانے کی جس غیر معمولی صلاحیت، جزرسی اور نکتہ سنجی و نکتہ آفرینی کا مظاہرہ کیا ہے وہ اگر موجودہ حالات میں بالکل ناپید نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ سہیل انجم برسہا برس تک صحافت کے خارزار میں اپنے تلووں کو لہولہان کرتے رہے ہیں۔ وقت کی چلچلاتی دھوپ میں وہ ایک مدت تک کسی شجر سایہ دار یا سائبان کی تلاش میں سرگرداں رہے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ تحمل، یہ قوت برداشت، ہر تلخ بات کو نرم لہجے میں کہہ ڈالنے کی غیر معمولی صلاحیت اور تنقیص کے بجائے صحت مند تنقید کی ڈگر پر چلتے چلے جانے کا جو حوصلہ ان کی کتاب کے سطور اور بین السطور دونوں میں ہی پوری قوت کے ساتھ جھلکتا ہے، غالباً انہی دنوں کی دین ہے۔

سہیل انجم صحافی ہیں، معلم اخلاق نہیں۔ یہ بات انھیں اچھی طرح معلوم ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ جس سماج کے وہ فرد ہیں ان پر اس کی بھی کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ وہ جس پیشے سے وابستہ ہیں کم از کم اس کے حوالے سے تو انھیں سماج کے تعلق سے کچھ نہ کچھ کرنا ہی چاہئے۔ چنانچہ انھوں نے صحافت خاص کر الیکٹرانک میڈیا کی بے راہ روی کی گرفت کی ہے مگر اپنے مخصوص انداز میں۔ انھوں نے اپنے قلم

کو جراح کے نشتر کی طرح استعمال کیا ہے، جلاد کے چھرے کی طرح نہیں۔ مثال کے طور پر اسٹنگ آپریشن کو وہ قابل اعتراض تصور کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اسٹنگ آپریشن دانہ ودام کی قدیم تکنیک کی بھونڈی تجدید ہے۔ انھیں بریکنگ نیوز کے لیے دیانت اور صحت مند صحافت کے تمام اصولوں کو نظر انداز کر کے آپس کی مارا ماری بھی پسند نہیں۔ اور کسی بھی صحیح الفکر شخص کو بھی پسند نہیں آسکتی۔ ان کے لیے یہ بات بھی اذیت ناک ہے کہ الیکٹرانک میڈیا میں سیکس پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ جرائم سے متعلق رپورٹیں بھی اس طرح دکھائی جا رہی ہیں کہ ان پر سیکس کا عنصر غالب رہے۔ لیکن وہ ان تمام معاملات پر اظہار خیال کرنے میں احتیاط کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان کی تنقید بھی دل سوزی اور دردمندی کی اعلیٰ مثال ہوتی ہے۔

سہیل انجم کی اس کتاب میں خاص طور پر اردو قارئین کو بہت کچھ ایسا ملے گا جس سے ان کی معلومات میں خاصا اضافہ ہوسکتا ہے۔ خبروں کی ترسیل کا پیچیدہ نظام، ایس ایم ایس اور ایسی بہت سی چیزوں پر سے یہ کتاب پردہ اٹھاتی ہے جو اردو والوں کے لیے خبروں کے حوالے سے نئی چیز ہوگی۔ سہیل انجم بنیادی طور پر اردو کے صحافی ہیں اور روایت کے مطابق انھیں اپنی کتاب کے بیشتر حصوں میں اردو کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں، ناانصافیوں اور حق تلفیوں کا رونا رونا چاہئے تھا لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور کرنا بھی نہیں چاہئے، اس لیے کہ اردو صحافت کو اس کا حق بھیک کی طرح نہیں ملے گا جب اردو والے اپنا حق حاصل کرنے کی پوزیشن میں آجائیں گے اور اپنے آپ کو ہر اعتبار سے اس لائق بنالیں گے کہ انھیں نظر انداز نہ کیا جائے تو یہ حق انھیں خود بخود مل جائے گا۔ اس تلخ حقیقت کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اردو صحافت اپنی تکنیکی پیش رفت، اپنے معیار اور اپنے وسائل کے اعتبار سے دوسروں سے بہت پیچھے ہے۔ اسے اپنے آپ کو ان کی سطح پر لانا ہوگا۔ اس کے بعد ہی وہ کچھ حاصل کرنے کی پوزیشن میں ہو سکے گی۔ سہیل انجم نے اردو صحافت کے بجائے مجموعی طور پر پورے میڈیا کو موضوع بحث بنایا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس کا حق بھی ادا کر دیا ہے۔

اردو صحافت: کچھ تلخ تجربات

موہن چراغی

ایڈیٹر روزنامہ قومی آواز، نئی دہلی

قومی آواز میں میرے ساتھی سہیل انجم نے اردو صحافت، نیشنل پریس، الیکٹرانک میڈیا اور مجموعی طور پر میڈیا سے متعلق دوسرے اہم موضوعات پر اپنے جن خیالات اور تاثرات کا اظہار کیا ہے، اور جو تجزیہ کیا ہے اس سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ لیکن اس بات کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا کہ سہیل انجم نے فرسودہ روایات سے ہٹ کر ان موضوعات پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جن پر صحافت کے بڑے چودھری خاموشی سے بھی اپنی رائے ظاہر کرنے سے خوف کھاتے ہیں۔

صحافت اب پیشہ ہے اور اسے مشن سمجھنا صحافت کے پیشہ سے ناانصافی ہے۔ صحافی اس سماج کا حصہ ہے جس سماج پر ہوس زر، نامعلوم منزل تک پہنچنے کے لیے کئی کئی سیڑھیاں پھلانگ کر آگے نکلنے کی قیامت خیز دوڑ اور سیاسی مٹھ دھاریوں کے سیاسی اکھاڑے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ہر مٹھ کے چوکھٹ پر ناک رگڑنے کی تیز خواہش کا بدگوشت چڑھ گیا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ صحافی کسی بھی زبان میں لکھتا ہو، وہ نہ تو بدگوشت زدہ سماج سے باہر کوئی آسمانی مخلوق ہے اور نہ ہی وہ شدھ دودھ میں دھلا دیوتا ہے۔ صحافی ایک عام انسان ہے جو حیوانی خواہشات، کم وقت میں ڈھیر ساری دولت حاصل کرنے کی زبردست خواہش اور بیباک اور نڈر صحافت میں یقین رکھنے کی نمائش کی نیک یا بدخصلتوں سے پاک نہیں ہے۔ اس لیے صحافت کا،

چاہے وہ کسی بھی زبان کی ہو پوسٹ مارٹم کرتے وقت اس بات کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے کہ جب ہم صحافت پر قلم اٹھائیں تو ہم کو پورے سماج کا پوسٹ مارٹم کرنا چاہئے۔ میں جب انگریزی زبان کی صحافت سے بھٹک کر اردو صحافت میں ۲۵ برس پہلے آیا تھا تو میرے ذہن میں اردو صحافت کے بارے میں ایک خاص خاکہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان سے میں ٹوٹ کر پیار کرتا تھا۔ حالانکہ میرے پاس اردو زبان کی کوئی ڈگری نہیں ہے نہ میں شاعر ہوں اور نہ ہی ادیب، البتہ مجھے احساس ہے کہ میں اپنے اندر کے جذبات کو اردو زبان کے ذریعہ باہر لاسکتا ہوں۔ میں جب اردو صحافت کی جنت سے باہر تھا تو ہر وقت مجھے یہ خواہش ستاتی رہتی تھی کہ اس جنت میں کیسے داخلہ ملے گا اور جب اس جنت میں داخل ہونے کا موقع ملا تو مجھے مرحوم لیش پال کپور جیسے نڈر اور باصلاحیت سرپرست اور عشرت علی صدیقی جیسے عظیم اردو صحافی کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ یہ وہ یُگ تھا جب قومی آواز کا طوطی بولتا تھا اور اس میں کام کرنے والے سبھی ساتھی میری طرح بے چہرہ اور بے نام تھے۔ لیکن قومی آواز ہماری پہچان بن گیا۔ اور ہم بے نام ہو کر بھی نیک نام بن گئے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جب تاجر پیشہ اور کاروباری ذہنیت کے لوگوں نے اردو صحافت کی طرف رُخ کیا اور سیاستدانوں نے اردو صحافت کو اپنے ووٹ بینک کا بیئرر چیک بنادیا تو اردو صحافت جو کہ پہلے ہی Developed صحافت نہیں تھی عرش سے فرش پر آگئی اور مجھ جیسا اردو صحافی بھی محسوس کرنے لگا کہ اس جنت میں داخل ہونے کی خواہش خودکشی تھی۔ ۲۵ برسوں کے تجربے کا نچوڑ یہ ہے کہ اردو صحافت ابھی تک اپنے وجود کو منوا نہیں سکی ہے اور نہ ہی تنگ و تاریک حلقوں سے آزاد ہو کر مثبت رول ہی ادا کر پا رہی ہے۔ ہم جب ۱۹۴۷ء سے قبل کے اردو اخبارات کے حوالے سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو صحافت نے انقلابی رول ادا کیا ہے تو ہم بھول جاتے ہیں کہ اردو صحافت کے ساتھ بلند پائے کے باصلاحیت نثر نگار ضرور وابستہ رہے ہیں لیکن وہ سب کے سب صحافی نہیں تھے۔ اگر وہ صحافی ہوتے تو انھوں نے اردو صحافت کو ایک نئی سمت دی ہوتی۔ خبر نگاری کیا ہے، تجزیہ نگاری کیا ہے، سماج کے ہر طبقہ کے احساسات اور خواہشات کی عکاسی غیر جانبداری بلاتعصب اور رو کے ساتھ بہے بغیر کیسے کی جاسکتی

ہے اس طرف بلند پائے کے صحافی نما نثر نگاروں نے توجہ نہیں دی۔

اردو صحافت کا المیہ یہ ہے کہ خود اردو والوں اور سیکولر سیاست کا اٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے بے سُرا ہارمونیم بجانے والوں نے اردو زبان کو قومی دھارے سے دور رکھا۔ اردو زبان کو مسلمان بنایا گیا اور اس طرح اردو صحافت سماج کے ایک حلقہ کی ترجمان بن گئی۔ اگر اس بے معنی اور بے مقصد دلیل کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اردو اقلیت کی زبان ہے تو اردو صحافت بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں کے حقیقی مسائل اور مشکلات کا احاطہ کرنے اور ان کی رہبری کرنے میں مکمل طور سے ناکام رہی ہے۔ اردو صحافت نے ہمیشہ مسلمانوں کو خوفزدہ کرنے اور احساس کمتری میں مبتلا رکھنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو صحافت نے مسلمانوں کی خود اعتمادی کو توڑ کر انھیں اپنے وجود سے مایوس کیا ہے۔

اردو صحافت کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اردو کو ووٹ بینک سیاست نے ترقی کے زینے طے کرنے کا ایک اہم میڈیم بنا دیا ہے۔ ایک سرمایہ دار نے جب اردو صحافت کی طرف رخ کیا تھا تو مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی کہ یہ سرمایہ دار اردو اخبار کو ایک با مقصد میڈیم بنانے کے لیے سرمایہ کاری کرے گا لیکن اس نے بھی اس کو ووٹ بینک سیاست کا میڈیم بنا کر اپنے اردو اخبار کو اسی راہ پر لگا دیا جس راہ پر چل کر اردو صحافت اپنا وجود منوانے میں کامیاب نہیں رہی ہے۔ سہیل انجم نے اس طرف اشارے تو کیے ہیں لیکن کھل کر اپنے اندر کی بات باہر لانے سے گھبرا گئے ہیں۔ قصور ان کا بھی نہیں ہے کیونکہ اردو صحافت میں ایک ایسا مفاد خصوصی رکھنے والا گروپ حاوی ہے جو اپنے نجی مفادات کے لیے اردو میڈیا کو ووٹ بینک سیاست سے جوڑے رکھنے پر بضد ہے۔ ۲۵ برس تک میں نے اردو صحافت کو ایک زندہ میڈیم بنانے کی طرف ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن ناکام رہا۔ قدم قدم پر اسپیڈ بریکر، قدم قدم پر فرسودہ روایات، بوڑھی سوچ اور زر پرستی حائل ہوتی رہی۔ جب میں قومی آواز میں شامل ہوا تھا تو میں پُر امید تھا کہ قومی آواز نئے انداز کا ایک عوامی میڈیم بنے گا۔ لیکن ۲۵ برسوں کے بعد اب میں اردو صحافت کے مستقبل سے اس حد تک مایوس

ہوں کہ اپنے آپ کو کوستا رہتا ہوں کہ میں نے انگریزی صحافت سے اردو صحافت کی طرف کیوں رخ کیا۔

مایوسی کے اس دور میں بھی مجھے سہیل انجم جیسے اردو صحافیوں سے نئی تحریک مل رہی ہے۔ اگر سہیل انجم اور ان جیسے دوسرے نوجوان اردو صحافی اپنے آپ کو بدگوشت چڑھے سماج سے علاحدہ نہ کرکے خود کو اسی سماج کا ایک انگ سمجھ کر بدگوشت کی جراحی کی طرف توجہ دیتے رہیں گے تو اردو صحافت مثبت تبدیلی کا میڈیم بن سکتی ہے۔

جہاں تک الیکٹرانک میڈیا کا تعلق ہے، اس سے مایوسی دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔ جن مدعوں کا ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہیں ان پر ایسی بحث کی جاتی ہے کہ اہم ایشوز نظرانداز ہوتے رہتے ہیں اور صرف منفی پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ چند ایک چینلوں کو چھوڑ کر باقی تمام چینل اقلیتوں کے مسائل کا اس انداز سے محاسبہ کرتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقلیتیں ہندوستانی سماج کا حصہ نہیں ہیں بلکہ وہ ایسی مخلوق ہیں جو ذہنی طور پر پسماندہ ہیں اور اپنی سوچ بدلنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ سہیل انجم نے اپنی کتاب میں ان تمام موضوعات پر تبصرہ کیا ہے، لیکن میرا ماننا ہے کہ انھیں بنیادی طور پر صرف اردو صحافت کی طرف ہی خصوصی توجہ دینی چاہئے تھی، کیونکہ الیکٹرانک میڈیا بھی اردو سے جڑا ہے۔ یہ خیالات قلمبند کرتے وقت میں نے بے ایمانی کی ہے کہ میں نے کھل کر اردو صحافت پر بحث نہیں کی۔ گو مجھ میں جرأت ہے صحیح بات کہنے کی لیکن اس وقت میرا بھی قلم پابند ہے۔ اس قید سے آزاد ہونے کے بعد ہی میں کھل کر اپنے تجربات اور اپنی کامیابیوں و ناکامیوں کو کتابی شکل دوں گا۔

(۲)

میڈیا اپنے آئینے میں

میڈیا اور ہمارا معاشرہ

میڈیا یعنی اخبارات، ریڈیو، ٹی وی، کمپیوٹر، ہوم ویڈیو، سٹیلائٹ اور انٹرنیٹ وغیرہ کی آج پوری دنیا میں زبردست اہمیت ہے۔ آج کی دنیا بیل کے سینگ پر نہیں ابلاغ کے انہی ذرائع پر ٹکی ہوئی ہے اور یہ ذرائع ہماری سماجی، معاشی، تجارتی، تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی پر بری طرح اثر انداز ہو رہے ہیں۔ انسانی زندگی کا کوئی بھی ایسا شعبہ اور گوشہ نہیں ہے جو ان ذرائع کی دسترس سے دور ہو۔ کسی ہندی شاعر نے کہا تھا کہ جہاں نہ پہنچے روی وہاں پہ پہنچے کوی۔ یعنی جہاں سورج کی روشنی کا گزر نہیں ہو سکتا وہاں شاعر پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اب یہ دعویٰ بہت پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ اب تو یہ کہا جانا چاہئے کہ جہاں سورج کی روشنی نہیں پہنچ سکتی یا جہاں تک شاعر کا خیال نہیں جا سکتا وہاں بھی میڈیا اور ذرائع ابلاغ وترسیل کے نمائندے پہنچ جاتے ہیں۔ ہم جس گزرگاہ سے گزرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے وہاں کیمرے نصب ہو رہے ہیں اور ہم اپنے گھر آنگن میں بیٹھ کر وہاں کے مناظر سے آنکھیں چار کر رہے ہیں۔ پھر چاہے وہ عراق کا گڈھا ہو جہاں سے امریکی افواج نے صدام حسین کو گرفتار کر کے باہر نکالا یا پھر افغانستان میں تورابورا کی وہ سنگلاخ پہاڑیاں ہوں جو القاعدہ اور طالبان کی کمین گاہیں تھیں۔ کوئی بھی جگہ ان کی دسترس سے دور نہیں ہے۔

ان ذرائع کی برکتوں سے وسیع وعریض دنیا سمٹ کر ہمارے ڈرائنگ روم اور بیڈ روم میں آ گئی ہے اور گھر کی کھڑکیاں کھول کر پورے عالم کا نظارہ کرنا اب بہت چھوٹی سی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ اب ہم ایک کمرے میں ایک میز پر بیٹھ کر اور محض ایک بٹن دبا کر آنِ واحد میں دنیا بھر کی سیر کر سکتے ہیں۔ ٹکنالوجی اور ذرائع ابلاغ وترسیل کی اس ترقی کو دیکھ کر ہی دورِ جدید کے الیکٹرانک مسیحا مارشل میکلوہان نے آج کی دنیا کو گلوبل ویلیج یا عالمی گاؤں کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس